دینی فرائض
کا
جامع تصور

ڈاکٹر اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی

67-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔ فون 36293939-36316638-36366638
فیکس 36271241 ای میل markaz@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

تمہید

سب سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس موضوع یعنی ''دینی فرائض کا جامع تصور'' کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے۔ دیکھئے اگر کسی شخص کو ملازم رکھا جائے اور اسے اس کی ذمہ داریاں اور فرائض معین طور پر گن کر بتا دیے جائیں کہ مثلاً یہ دس کام یا فرائض (duties) ہیں جو آپ کو انجام دینے ہیں تو اب اگر بالفرض وہ شخص ان میں سے چار فرائض سرے سے بھول جائے اور اسے چھ ہی یاد رہیں' تو اس کے باوجود کہ وہ شخص پورے خلوص اور امکانی حد تک محنت سے ان چھ کاموں کو انجام دینے کی سعی کرے اور اس میں کامیاب بھی ہو' لیکن جو چار فرائض اسے یاد ہی نہیں رہے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کو بجا نہیں لاسکتا' اور کوئی عجب نہیں کہ یہی اہم ترین فرائض ہوں۔ اس لیے میں اِن شاء اللہ کوشش کروں گا کہ دینی فرائض کا ایک جامع ترین تصور آپ کے سامنے پیش کروں۔

انسانی عمل کے دو محرکات

انسان کے عمل میں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں محرک کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ایک نیت و ارادہ اور دوسری فرائض کا صحیح شعور اور تصور۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اس کی توحید کے اثبات اور شرک کے اجتناب کے ساتھ مانا ہے۔ جناب حضرت محمد ﷺ پر ہمارا ایمان ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر یہ کہ بعث بعد الموت اور محاسبۂ اُخروی پر بھی ہمارا کامل یقین ہے۔ تو اس ایمان و تسلیم اور ایقان و تصدیق کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا جو حکم ملے وہ سر آنکھوں پر۔ اس کی بڑی اہمیت ہے' اس لیے کہ اگر یہ نیت اور ارادہ ہی نہ ہو تو آگے قدم اُٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ گویا اعمالِ انسانیہ میں ''ارادہ'' کو بنیادی مقام حاصل ہوتا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ اسی لفظ ارادہ سے اسم فاعل ''مرید'' بنتا ہے۔ ہمارے یہاں تزکیۂ نفس کا جو نظام عرصۂ دراز سے چلا آ رہا ہے اس کا نقطۂ آغاز ہی یہ لفظ ''مرید'' ہے۔ ''مرید'' سے

مراد وہ فرد ہے جو اس بات کا ارادہ کر لے کہ وہ دین پر چلے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی ایسے شخص سے اپنا تعلق جوڑتا ہے جس پر اسے اعتماد ہو کہ یہ شخص مخلص ہے' دکاندار نہیں ہے۔ مزید برآں یہ اطمینان بھی ہو کہ یہ دین کو جاننے والا اور بذاتِ خود پابند شریعت اور متقی شخص ہے' اور یہ کہ اس کی صحبت میں اس کو دین پر چلنے میں تقویت حاصل ہوگی۔ ارادہ تو اس کا اپنا ہوتا ہے' لیکن اس کے لیے تقویت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ کسی متقی و دین دار عالم کو اپنا مرشد تسلیم کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے' یعنی بیعت کر کے یہ قول و قرار اور عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے اس مرشد کی ہدایات پر عمل پیرا ہوگا اور دین پر چلے گا۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ''مرید'' وہ شخص ہے جو دین پر کاربند ہونے کے ارادے سے کسی صاحب حال سے تعلق استوار کرے۔ اور جس سے تعلق قائم کیا جائے وہ مزکی و مربی اور مرشد کہلاتا ہے' جس کے لیے فی الوقت ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''پیر'' مروّج ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے اپنی بے عملیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے جہاں دین کی بہت سی باتوں اور بہت سے کاموں کو بدنام کر رکھا ہے' وہاں پیری مریدی کے سلسلے کو بھی سخت بدنام کیا ہے۔ پھر واقعتاً یہ سلسلہ ہمارے معاشرے میں خالص دکانداری اور محض رسم بن کر رہ گیا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ!

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ پہلی ضروری چیز اپنا ارادہ ہے' لیکن اتنی ہی ضروری چیز یہ ہے کہ یہ صحیح تصور بھی موجود ہو کہ دین کے حقیقی فرائض کیا ہیں! اگر فرائض کا تصور محدود یا ناقص ہوگا تو جو چیزیں کسی کو معلوم ہیں ان پر تو وہ عمل کر لے گا لیکن جو چیزیں اسے معلوم ہی نہیں ہیں' ان پر ارادے کے باوجود وہ عمل کیسے کر سکے گا؟ چنانچہ میں آج کی اس صحبت میں اس دوسری بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے دینی فرائض کا صحیح اور جامع تصور کیا ہے' تاکہ پورے دین کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے موجود ہو اور ہم صحیح طور پر اپنا جائزہ لے سکیں کہ دین کے کتنے حصے پر ہم عمل پیرا ہیں اور کتنی چیزوں پر عمل نہیں کر رہے! اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جن چیزوں پر عمل ہم نے چھوڑ رکھا ہے وہی چیزیں دینی لحاظ سے اہم ترین ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مغز سرے سے موجود ہی نہ ہو اور ہم صرف چھلکا پکڑے بیٹھے ہوں! شاید آپ نے یہ لطیفہ سنا ہو کہ جب پہلے پہل چائے یورپ

گئی تو وہاں لوگ یہ کرتے تھے کہ چائے ابال کر پانی پھینک دیتے تھے اور پتی کھاتے تھے۔ تو کہیں ہمارا حال یہ تو نہیں ہے کہ دین کی اصل ذمہ داریوں اور دین کے اصل فرائض سے صرفِ نظر ہو رہا ہو؟ وہ سرے سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہی نہ ہوں اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ہم دیندار ہیں اور پورے دین پر عمل پیرا ہیں! اس کا ازالہ اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ہمارے سامنے دین کا پورا خاکہ اور دینی فرائض کا جامع تصور موجود ہو۔

میرا تصورِ فرائضِ دینی

قرآن مجید اور سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے محدود معروضی مطالعے سے اس ضمن میں مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو فہم حاصل ہوا ہے اور جس پر میں اپنی استعداد کے مطابق اور امکان بھر عمل پیرا ہوں‘ میں وہی آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں‘ کوئی تعلّی اور ادعاء نہیں‘ صرف اظہارِ واقعہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے مطالعے اور فہم میں بھی کوئی کمی‘ نقص اور تقصیر ہو۔ کوئی بات آج میرے علم میں نہ ہو‘ کل آ جائے۔ جب بھی وہ علم میں آئے گی اِن شاء اللہ العزیز اسے بھی بیان کر دوں گا۔ لیکن آج کی تاریخ تک قرآن حکیم‘ سنت و سیرت نبویؐ اور سیر صحابہؓ کے مطالعے سے اور اس اُمت کی پوری تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دینی فرائض کا جو صحیح و جامع تصور میرے سامنے آیا ہے‘ اس کو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

فرائض دینی اور اِن کے لوازم

اس ضمن میں تین باتیں تو بنیادی و اساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔ یہ کُل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی و اساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداءً بھاری بھرکم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ فزکس نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات (basic terminologies) نہ آ جائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی

اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں‘ اس پر کاربند ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں۔ اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔ اب ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھ لیجیے۔

پہلا فریضہ —— دین پر کاربند ہونا

پہلی بات کے لیے اب دینی اصطلاحات نوٹ کیجیے۔ تھوڑے سے فرق سے اس کے لیے چار اصطلاحات ہیں: اسلام‘ اطاعت‘ تقویٰ اور عبادت۔

(۱) **اسلام** : سب سے پہلی اصطلاح خود ''اسلام'' ہے۔ اسلام کا معنی ہے گردن نہادن‘ سرِ تسلیم خم کر دینا۔ انگریزی زبان میں اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ to give up resistance اور to surrender۔ مفہوم یہ ہوا کہ سر جھکاؤ‘ سرِ تسلیم خم کرو اور جو بھی حکم ملے اسے بلاچون و چرا قبول کرو۔ اس رویے کا نام ہے اسلام —— اور اس ''اسلام'' کے لیے قرآن کا تقاضا یہ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ: ۲۰۸)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔''

اس میں داخلہ جزوی طور پر نہیں ہوسکتا کہ کچھ احکام پر تو سرِ تسلیم خم ہے اور کچھ احکام پر عمل کرنے سے انکار و اعراض‘ سرتابی اور سرکشی! اس کا نام اسلام نہیں ہے۔ یہاں تو اصول یہ ہے کہ ماننا ہے تو پورا مانو‘ ورنہ چھوڑو اور دفع ہو جاؤ۔ (Take it all or leave it all) یہاں بیچ بیچ کی بات نہیں چلے گی۔

(۲) **اطاعت** : یہ اسی طرزِ عمل کے لیے دوسری اصطلاح ہے۔ اب معاملہ ذرا آگے بڑھ گیا ہے۔ لفظ اسلام میں تو مقاومت و مخالفت (resistance) ترک کر کے خود کو حوالے (surrender) کر دینے کا مفہوم تھا‘ جبکہ اطاعت کا لفظ ''طوع'' سے بنا ہے‘ جس کا معنی ہے دلی آمادگی۔ اردو میں ہم ''بطوعِ خاطر'' کے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں۔ گویا دلی آمادگی کے ساتھ

فرماں برداری قبول کر لینے کے رویے کا نام اطاعت ہے۔ اوراس کے لیے اصول یہ ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝١٢﴾ (التغابن)

''اوراطاعت کرواللہ کی اوراطاعت کرورسول (ﷺ) کی' اوراگرتم روگردانی کرتے ہوتو جان لوکہ ہمارے رسول پرسوائے واضح طور پر (ہدایات وتعلیماتِ ربّانی) پہنچانے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

یہاں بھی وہی انداز ہے جو میں اسلام کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں' یعنی یہاں بھی ''all or none law'' کارفرما ہے۔ ہمارے نبیؐ کے ذمہ پہنچانا تھا' سوانہوں نے پہنچا دیا' اب تم اپنا رُخ کسی اورطرف کرنا چاہتے ہو' اس دعوت سے اعراض اختیار کرنا چاہتے ہوتو تم اپنی اس سرتابی وسرکشی کے خود ذمہ دار ہوگے۔ تو اسلام ﴿اُدْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ کے تقاضے اور اطاعت کے مطالبے کے ساتھ مطلوب ہے۔ پھر یہ اطاعت بھی ہمہ تن اور ہمہ جہت درکار ہوگی۔ یہاں بھی یہ نہیں ہوگا کہ کچھ حکم مانیں گے اور کچھ حکم نہیں مانیں گے۔

(۳) **تقویٰ**: اس ضمن میں یہ تیسری اصطلاح ہے۔ اسلام اوراطاعت انسان کے مثبت رویے اور طرزِ عمل کے مظاہر ہیں۔ ان ہی کو منفی اسلوب سے بیان کیا جائے گا تو وہ ہوگا ''تقویٰ''۔ اس کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' اس کی نافرمانی سے احتراز کرنا' اس کی ناراضی کا خوف رکھنا' اس کی سزا سے ڈرنا' اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔ اس کے لیے تراجم میں ''پرہیزگاری'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور ''ڈرنا'' بھی' لیکن کسی اصطلاح کے ایک لفظ میں ترجمہ سے اس کا صحیح اور مکمل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝١٠٢﴾

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے' اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔''

سورۂ آلِ عمران کی اس آیت مبارکہ میں سلبی رویہ ''تقویٰ'' اور مثبت رویہ ''اسلام'' دونوں کا ذکر

نہایت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔

(۴) **عبادت**: اس ضمن میں یہ چوتھی اصطلاح ہمہ گیر اور جامع ترین بلکہ اصل اصطلاح ہے۔ یہاں بات اور آگے بڑھی۔ دینی اعتبار سے لفظ عبادت کا اصطلاحی مفہوم ہوگا ''کسی کی محبت سے سرشار ہو کر ہمہ تن' ہمہ وجوہ اور ہمہ وقت اس کی بندگی میں اپنے آپ کو دے دینا۔'' قرآن حکیم میں انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اللہ کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الذاریات میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝٥٦﴾

''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

گویا انسان کا مقصدِ حیات ہی بندگی ہے' غایتِ تخلیق ہی بندگی ہے۔

''عبادت'' کے مفاہیم و معانی اور مقتضیات و مقدرات پر اس سے قبل بارہا گفتگو ہوئی ہے' آج ان سب کو جامعیت کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ عربی کے لفظ عبادت کا مفہوم فارسی کے دو الفاظ کو' جو اردو میں بھی مستعمل ہیں' جمع کر کے ادا کیا جا سکتا ہے۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش۔ بندگی میں اطاعت کا پہلو ہے اور پرستش میں محبت کا! بندہ کے معنی ہیں غلام ـــ اور غلام ہمہ وقت اور ہمہ تن غلام ہوتا ہے۔ غلامی اور ملازمت میں یہی تو فرق ہے کہ ملازمت کسی معین کام کے لیے ہوتی ہے۔ مثلاً جو شخص جھاڑو دینے پر ملازم ہے وہ جھاڑو ہی دے گا' کوئی اور کام تو نہیں کرے گا۔ اسی طرح جو باورچی کی حیثیت سے ملازم ہے وہ آپ کے گھر کا فرش تو صاف نہیں کرے گا۔ پھر ملازمت معین وقت کے لیے ہوتی ہے۔ ملازم سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ اسے چار گھنٹے کام کرنا ہے یا چھ یا آٹھ گھنٹے۔ اس کے بعد وہ آپ کا ملازم نہیں۔ لیکن غلامی یا بندگی ہمہ وقت اور ہمہ تن ہوتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت خوبصورتی سے شعر کے پیرائے میں اس مفہوم کی ترجمانی کی ہے کہ ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

پس ذہن میں رکھئے کہ بندگی کے معنی ہیں ہمہ وقتی' ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اطاعت۔ لیکن محض بندگی یا غلامی ''عبادت'' نہیں ہے جب تک کہ اس میں پرستش شامل نہ ہو۔ پرستش میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ زر پرست وہ ہے جس کو مال سے انتہائی محبت ہو۔ وطن پرست' قوم پرست اور شہرت پرست جیسے الفاظ ہمارے ہاں کثرت سے مستعمل ہیں۔ پرستش اور پرستاری ہمارے جانے پہچانے الفاظ ہیں۔ ''پرستار'' ہم بولتے ہیں ''انتہائی محبت کرنے والے'' کے معنی ومفہوم میں۔ چنانچہ عبادت کا مفہوم ہوگا اللہ کی بندگی اور اس کی پرستش۔

جزوی اطاعت قابل قبول نہیں: یہ چار اصطلاحات ہیں جن سے دین کا پہلا اور بنیادی تقاضا ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اصل شے سمجھنے کی یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کو اللہ کی اطاعت کے دائرے میں لانے کا نام بندگی ہے۔ اسلام میں جزوی اطاعت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے' اس کا مطالبہ کلی اطاعت ہے ـــــ اس ضمن میں ایک آیت مَیں آپ کو سنا چکا ہوں' یعنی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ۔ ایک دوسری آیت اور ملاحظہ کیجیے جس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس آیت میں خطاب یہود سے ہے' لیکن یہ بات جان لیجیے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ یہود کو قرآن نے اُمت مسلمہ کے لیے نشانِ عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر اُمت مسلمہ بھی یہ روش اختیار کرتی ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں یہود کے حوالے سے کیا گیا ہے تو پھر ان کے لیے بھی وہی سزا ہوگی جس کے مستحق یہود قرار دیے گئے تھے۔ فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''کیا تم (ہماری) کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں اسے ذلیل و خوار کر دیا جائے' اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

یہ وعید اس لیے ہے کہ یہ طرزِ عمل کہ کچھ باتوں کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا' اس کے ڈانڈے درحقیقت منافقت سے جڑ جاتے ہیں۔ یہ دوعملی ہے' دورنگی ہے' یہ دوُرخا کردار ہے' جبکہ اللہ کو یک رنگی درکار ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (البقرۃ:۱۳۸) ''(ہم نے تو) اللہ کا رنگ (اختیار کر لیا ہے)' اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟'' پس دورنگی منافقت ہے اور منافقت وہ روگ ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے صراحت کی ہے کہ:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ (النساء)

''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے' اور وہ اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔''

جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے تھوڑا بہت شغف ہے' وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب کافروں پر اتنا نہیں بھڑکتا جتنا منافقوں پر بھڑکتا ہے۔ سورۃ الصّف میں ہم نے ان دو آیات کا مطالعہ بھی کیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾﴾

''اے اہل ایمان! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ یہ بات اللہ کے نزدیک سخت بیزاری پیدا کرنے والی ہے کہ تم جو کہو اس کو کرو نہیں!''

ہم اپنے آپ کو کہتے ہیں مسلم ـــــ اور مسلم کا معنی ہے مطیع فرمان۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کو اُٹھا کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ بندے کا معنی ہے غلام۔ اس حیثیت سے ہمیں اللہ کے تمام احکام ماننے چاہئیں' ان پر عمل کرنا چاہیے۔ جس کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے اسے ترک کرنا چاہیے اور جن چیزوں کو واجب اور فرض قرار دیا ہے ان کو ادا کرنا چاہیے۔ اگر ہم اللہ کے ان احکام کو جو ہمیں پسند نہ ہوں' پس پشت ڈال دیں تو ہم پر یہ بات بالکل صادق آئے گی کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ!!

ارکانِ اسلام اور ان کی اہمیت: ہماری اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دین کے تقاضوں میں سے پہلا تقاضا اسلام پر کاربند اور عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے لیے چار اصطلاحات ہیں: (۱) اسلام (۲) اطاعت (۳) تقویٰ (۴) عبادت۔ ان میں جامع ترین اصطلاح عبادت ہے' جس کا مفہوم ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت بندگی اور پرستش ہے' یعنی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کلی اطاعت!

اب میں چاہوں گا کہ ضمیمہ (Appendix) کی حیثیت سے اس کے ساتھ یہ بات جوڑ لیجیے کہ یہ کام آسان نہیں ہے' بڑا مشکل ہے۔ اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ: ؎

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

یعنی میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے' کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے کیا لازم آتا ہے! جو اس کی حقیقت سے واقف نہیں انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا' لیکن جن کو اس کلمے کے تقاضوں اور مطالبوں کا علم ہے وہ تو واقعتاً یہ کلمہ زبان سے ادا کرتے ہوئے کانپ اُٹھتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ کرم فرمایا کہ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے چار عبادات عطا فرما دیں' جنہیں ارکانِ اسلام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

ہر شخص شہادتین کی ادائیگی سے اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ یہ گویا بنیاد اور فاؤنڈیشن ہے۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام ودعائمه العظام۔ واللفظ له۔

عملی ستون چار ہیں: نماز' زکوٰۃ' حج بیت اللہ اور رمضان کے روزے۔ ان ہی کو ہم "عبادات" کہہ دیتے ہیں' اگرچہ پورے قرآن مجید میں ان کے لیے لفظ "عبادت" کہیں نہیں آیا۔ عبادت کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جس کی تشریح میں نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہمہ وقت' ہمہ تن' ہمہ جہت اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی بندگی اور پرستش کرے۔ لیکن یہ "عبادات" اس فریضۂ عبادتِ ربّ کے لیے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دُور کرنے میں اس کی مدد و معاون ہوتی ہیں۔ چنانچہ نماز کا نظام اس لیے عطا ہوا کہ دن میں پانچ مرتبہ اپنی مصروفیات سے نکلو اور اللہ کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے قول و قرار ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ (الفاتحة) کی تجدید کرو اور اپنے ایمان کو تازہ رکھو۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝﴾ (طٰہٰ) "نماز قائم کرو میری یاد کے لیے"۔ کہیں مصروفیات میں گم ہو کر اپنے ربّ کو بھول نہ جاؤ۔ زکوٰۃ کی عبادت اس لیے مرحمت فرمائی ہے کہ مال کی محبت کو دل سے کھرچا جا سکے' جو بڑی تباہ کن شے ہے اور سو اَمراض کا ایک مرض ہے۔ روزہ اس لیے فرض ہوا کہ ﴿لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ "تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ!" نفس کا گھوڑا بڑا منہ زور ہے' اس کو لگام دینے اور قابو میں رکھنے کی روزوں کے ذریعے تربیت حاصل ہو جائے اور اس کے بے محابا تقاضوں سے بچا جا سکے۔ اور حج کے اندر یہ تمام برکات جمع کر دی گئیں۔ اس میں ذکر بھی ہے' طواف بھی ہے۔ اس میں احرام کی پابندیاں بھی ہیں جو روزے سے مشابہ ہیں۔ اس میں پیسے کا خرچ بھی ہے جو زکوٰۃ کے مشابہ ہے —— تو یہ چار ارکانِ اسلام یا چار عبادات اس لیے فرض کی گئیں تاکہ اسلام کی چھت ان ارکان یعنی ستونوں پر استوار ہو جائے۔ یہ ارکانِ اسلام عبادتِ کلی کے لیے سہارے اور support کا کام انجام دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ تسہیل فرمائی ہے اور ہمارے لیے یہ آسانی فراہم فرمائی ہے۔ یہاں پہلی بات سے متعلق گفتگو ختم ہوئی۔ اب آیئے دوسری بات کی طرف!

دوسرا فریضہ —— دین کو دوسروں تک پہنچانا

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارا دوسرا فرض اور ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسلام کو پھیلائیں۔ پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ ہم اس پر خود عمل پیرا ہوں' اس پر کاربند ہوں۔ لیکن دوسرا

فرض اور دوسری ذمہ داری اسلام کو پھیلانے سے تعلق رکھتی ہے۔اس ذمہ داری کے لیے بھی کئی اصطلاحات ہیں' لیکن چار کو ضرور ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) **تبلیغ** :یعنی پہنچانا۔دوسروں تک پہنچائیں گے تو اسلام پھیلے گا۔رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ﴾ (المائدہ : ٦٧)

''اے رسولؐ! پہنچا دو جو کچھ نازل ہوا ہے آپ ؐ پر آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دے دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً))[۱] ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت''۔حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے یہ فرما کر تبلیغ کی ذمہ داری تا قیامِ قیامت اُمت کے سپرد فرما دی کہ: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))[۲] ''اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں''۔

(۲) **دعوت** : یعنی لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾

(حٰمٓ السجدۃ :٣٣)

''اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو!''

اور:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل : ١٢٥)

''پکارو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان (کج بحثوں) سے مجادلہ کرو اس طور پر جو بہت عمدہ ہو۔''

(۳) **امر بالمعروف و نہی عن المنکر**: یہ اصطلاح بڑی اہم ہے۔امر بالمعروف کا مطلب ہے نیکی کا پرچار' نیکی کی تلقین' نیکی کا حکم۔اور نہی عن المنکر سے مراد ہے بدی

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسراء یل۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبة ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات۔ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

اور بُرائی سے لوگوں کو روکنا' بدی اور بُرائی کی اشاعت کے آڑے آنا۔اور اگر قوت و طاقت میسر ہو تو بدی اور بُرائی کو بزور روکنا۔اس کے لیے حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ' فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ' فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))[۱]

''تم میں سے جو کوئی بھی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) بدلے۔اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (یعنی تلقین و نصیحت سے اس بُرائی کو روکے)۔اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

یعنی کم از کم دل میں کڑھن تو ہو۔اگر یہ کڑھن بھی نہ ہو تو اس کیفیت کے لیے دوسری حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((......وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))[۲]

''......اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں۔''

یعنی تم بدی کو دیکھو' منکر کو دیکھو اور تمہارے احساسات پر جوں بھی نہ رینگنے پائے۔بُرائی کو دیکھتے ہوئے گزر جاؤ لیکن یہ صدمہ بھی نہ ہو کہ یہ کیوں ہو رہا ہے' کیوں میرے ہاتھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس کو روک سکوں! اگر یہ کیفیت ہے تو جان لو کہ ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی دل میں موجود نہیں۔اور یہ فتویٰ کس کا ہے؟ یہ حقیقی مفتیٔ اعظم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ہے۔ان کا فتویٰ کون ردّ کرے گا؟ اور اگر ردّ کرے گا تو کیا ایمان سلامت رہ جائے گا؟

(۴) **شہادت علی الناس**: یہ چوتھی اصطلاح جامع ترین ہے۔شہادت علی الناس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر حجت قائم کر دینا تاکہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو اور testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین پہنچا دیا تھا۔یہ وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر تبلیغ و دعوت کا تعلق کارِ رسالت سے جا کر جڑ جائے گا—— رسول کیوں بھیجے گئے؟ اس کو سورۃ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان...... عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

(۲) ایضاً ۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

النساء کی آیت ۴۱ سے سمجھئے جہاں فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؀﴾

''پس اُس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت میں سے (اُس پر) ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبیؐ) آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف!''

کیوں؟ اس لیے کہ رسول یہ گواہی دیں گے کہ اے ربّ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب اپنے اعمال وافعال کے یہ لوگ خود ذمہ دار ہیں—— اب بتایئے کہ یہ گواہی ہمارے حق میں جائے گی یا خلاف؟ ظاہر ہے یہ گواہی خلاف جارہی ہے۔ عدالتِ خداوندی میں رسول دراصل استغاثہ کے گواہ (Prosecution witness) ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام بے کم وکاست ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب ان کی ذمہ داری تھی کہ یہ تیرا پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر ان پر حجت قائم کریں۔

سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا کہ ہم نے جو تمہیں اُمتِ وسط یعنی بہترین اُمت بنایا ہے تو یہ اسی فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (بہترین اُمت) بنایا' تا کہ تم گواہ ہو جاؤ پوری نوع انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔''

عبادتِ ربّ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ دوسری اہم ذمہ داری ہے جو اُمت کے سپرد کی گئی۔ اس کی نزاکت کو جان لیجیے۔ اگر رسول بالفرض اللہ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے ہاں وہ مسئول اور ذمہ دار ہوتے! انہوں نے پہنچا دیا لہٰذا وہ بَری ہوگئے اور باقی دنیا کو پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے حوالے کر کے تشریف لے گئے۔ اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے' صرف عرب کے لیے تو نہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸) اور: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً

لِّلْعٰلَمِيْنَ ؀﴾ (الانبیاء)—— باقی دنیا کو کون پہنچائے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کر چکا کہ حجۃ الوداع میں آنحضور ﷺ نے فرما دیا کہ اب یہ کام تمہارے ذمے ہے۔ میں نے تمہیں پہنچا دیا' اب تم ان کو پہنچاؤ جو یہاں نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات مزید سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اُس وقت کی دنیا والوں کا معاملہ نہیں تھا۔ اب تو دائمی رسالتِ محمدی کا دَور ہے (علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اب تا قیامِ قیامت بنی نوعِ انسان کے لیے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کون ادا کرے گا؟ یہ ذمہ داری اُمت محمد کی ہے (علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اگر اُمت یہ فریضہ ادا نہیں کرتی تو جان لیجیے کہ دنیا کی گمراہی کا وبال اُس کے سر آئے گا۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا اُمتی ہونے سے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کریڈٹ مل جائے گا! میں آپ کو دوسرا رُخ دکھا رہا ہوں۔ یہ تو اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر آپ اسے ادا نہیں کرتے تو دنیا کی ضلالت اور گمراہی کا وبال بھی آپ کے ذمہ آئے گا۔ بنی نوع انسان عدالت اُخروی میں یہ عذر پیش کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ اے اللہ! ان کے پاس تیری آخری اور مکمل کتاب تھی' ان کے پاس تیرا دین تھا' یہ تیری شریعت کے علمبردار تھے' یہ تیرے آخری نبی اور رسول کے اُمتی تھے' انہوں نے اس دین کو نہ ہم تک پہنچایا اور نہ خود اس پر عمل کیا۔ یہ تیری آخری کتاب اور آخری نبیؐ کی تعلیمات پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔

میں آپ کی نصح وخیر خواہی کا حق ادا نہیں کر پاؤں گا اگر میں آپ کو متنبہ نہ کر دوں کہ اگر آپ کا طرزِ عمل یہ ہوگا تو آخرت میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خدارا مجھے بتایئے کہ اللہ ربّ العزت کی عدالت میں جب ہم سے یہ سوال ہوگا کہ تم ہمارے آخری نبی ورسول جناب محمد ﷺ کے اُمتی تھے' تمہارے پاس ہمارا دین تھا' تم حاملِ قرآن تھے' ہم نے چینیوں اور امریکیوں کو اپنا دین نہیں دیا تھا بلکہ اس کا وارث تم کو بنایا تھا اور یہ تمہاری ذمہ داری لگائی تھی کہ ان تک ہمارا دین پہنچاؤ' ہم نے محمد ﷺ کو روسیوں میں مبعوث نہیں کیا تھا' ان تک پہنچانا تمہارے ذمے تھا' تو ہمارے پاس کیا جواب ہوگا؟ دوسروں تک دین نہ پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہوگی یا نہیں؟ تو یہ ہے دوسری ذمہ داری جسے میں نے چار اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اور ہمارا حال

یہ ہے کہ ہم دوسروں تک تو کیا پہنچائیں گے‘ آج ہم خود محتاج ہیں کہ صحیح دین ہم تک پہنچے۔ ہم تو‘ اِلاّ ماشاءاللہ‘ پیدائشی طور پر (by birth) اور نام کے مسلمان ہیں کہ علامہ اقبال کے بقول: ؎

یوں تو سیّد بھی ہو‘ مرزا بھی ہو‘ افغان بھی ہو!
تم سبھی کچھ ہو‘ بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

تیسرا فریضہ ـــــ دین کو قائم کرنا

اب آیئے تیسری ذمہ داری کی طرف ـــــ یعنی یہ کہ دین کو قائم کیا جائے۔ ایک ہے تبلیغ و دعوت یعنی دین کو پھیلانا‘ اسے دوسروں تک پہنچانا‘ اس کی طرف لوگوں کو بلانا اور ایک ہے اسے قائم و غالب کرنا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام اگر ایک مکمل نظامِ حیات ہے‘ جیسا کہ فی الواقع وہ ہے ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ تو اسے بالفعل قائم کیا جانا چاہیے۔ ہم یہ بات بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ ہمارا دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ آج پاکستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جو یہ بات نہ جانتا ہو اور نہ کہتا ہو۔ یہ فکر بڑا عام ہے۔ کم از کم ہمارے دروس و خطابات کے سامعین اور ہمارے لٹریچر کے قارئین میں سے تو کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اس بات کو جانتا نہ ہو۔ تو اگر یہ دین ایک مکمل نظامِ حیات ہے تو اس کو قائم کیوں نہیں کرتے! یہ صرف تبلیغ و تلقین کی خاطر‘ یا محض تحقیقی مقالے لکھنے اور چھاپنے کی غرض سے‘ یا مدح سرائی کرنے اور قصیدے کہنے کے لیے تو نہیں ہے۔ نظام اگر بالفعل قائم ہو تو اسے نظام کہا جائے گا‘ ورنہ وہ نظام ہے ہی نہیں۔ پھر تو وہ محض ایک خیالی جنت (Utopia) ہے یا ایک ایسا نظریہ جس کا عمل کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو!

اس تیسری ذمہ داری کے لیے قرآن حکیم میں ہمیں چار اصطلاحات ملتی ہیں‘ جن میں سے دو مکی سورتوں میں وارد ہوئی ہیں اور دو مدنی سورتوں میں۔

(۱) **تکبیر رب:** یہ اصطلاح مکی سورتوں میں سے سورۃ المدثر میں آئی ہے‘ جہاں فرمایا گیا: ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ﴾ ”اور اپنے ربّ کو بڑا کرو!“ آپ شاید حیران ہوں کہ میں نے یہ کیا ترجمہ کیا

ہے!...... تو جان لیجیے کہ تکبیر کا لفظی معنی ہے کسی شے کو بڑا کرنا۔ تصغیر کا معنی ہے کسی شے کو چھوٹا کرنا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ربّ کو بڑا کرنا چہ معنی دارد؟ وہ تو بذاتہٖ بڑا ہے‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا والے اس کی بڑائی کو عملاً تسلیم نہیں کر رہے۔ چنانچہ تکبیر ربّ سے مراد ہے اس کی بڑائی کو منوانا‘ اسے تسلیم کرانا اور تشریعی معاملات میں اسی کے حکم کی تنفیذ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ﴾ اور بقول علامہ اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

غور کیجیے کہ اس لحاظ سے تو وہ کہیں بڑا نظر نہیں آتا! بڑے تو ہم بنے بیٹھے ہیں۔ کیا آج ہمارا طرزِ عمل یہی نہیں ہے کہ حکم تو بس ہمارا چلے گا‘ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کون ہے! بتایئے‘ آج پوری دنیا کا یہ رویّہ ہے کہ نہیں؟ ہم اذانوں میں کہہ دیتے ہیں ”اللہ اکبر“۔ جلسوں اور جلوسوں میں ”نعرۂ تکبیر“ کے جواب میں فلک شگاف انداز میں کہہ دیتے ہیں ”اللہ اکبر“...... لیکن کہنے کو جتنا چاہیں کہہ لیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے‘ حقیقت میں اللہ کہاں بڑا ہے؟ اس کی بڑائی اور اس کی کبریائی نظامِ حیات میں تو بالفعل کہیں بھی نافذ نہیں۔ حالانکہ ”تکبیر ربّ“ کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ (Absolute Sovereignty) کو تسلیم کیا جائے‘ مانا جائے کہ آخری اختیار اُس کا ہے اور آخری فیصلہ اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نظام قائم کرو گے تو تکبیر ربّ کا تقاضا پورا ہو گا۔

دیکھئے‘ نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی پہلا حکم ملا: ﴿اِقْرَاْ﴾۔ پہلی وحی میں تبلیغ اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں‘ البتہ ”اِقْرَاْ“ دو مرتبہ آیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾ (العلق)

دوسری وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات ہیں۔ وہاں باقاعدہ خطاب سے بات شروع ہوئی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱﴾ ”اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے!“ خطاب کے بعد پہلا حکم ملا: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝۳﴾ کھڑے ہو جاؤ‘ کمر بستہ ہو جاؤ‘ مستعد ہو کر اپنا فرضِ منصبی

ادا کرو! دو کام کرؤ انذار اور تکبیرِ ربّ! بنی نوعِ انسان کو خبردار اور آگاہ کرؤ نیند کے ماتوں کو جگاؤ کہ کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہؤ زندگی صرف یہ زندگی نہیں ہے اصل زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آئے گی۔ ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت) کہ اے لوگو! اچھی طرح جان لو یہ دنیا کی زندگی عارضی زندگی ہے اور بس ایک کھیل اور دل کا بہلاوا ہے اور اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا گھر ہے کاش لوگوں کو سمجھ آ جائے! اور یہ کہ قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن سب کو اپنے ربّ کے حضور میں جواب دہی کے لیے لازماً کھڑے ہونا ہوگا۔ ﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (المطفّفین) ''کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن (یعنی قیامت کے روز) اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب پوری نوعِ انسانی اس کائنات کے مالک کے سامنے (جواب دہی کے لیے) کھڑی ہوگی۔'' انسان اس زعم میں مبتلا نہ رہے کہ یہ محض ڈراوا ہے۔ یہ دن آ کر رہے گا اور یہی اصل ہار جیت کا دن ہوگا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ (التغابن:۹) ...... یہ انذار ہے اور یہی نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ لیکن جانا کدھر ہے آخری منزل کون سی ہے؟ اس کا تعین اگلی آیت میں کر دیا گیا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ یعنی وہ منزل ہے تکبیرِ ربّ! اور آپ غور کیجیے تیئیس سال میں آنحضور ﷺ نے تکبیرِ ربّ فرما دی کہ نہیں؟...... یہ ماننا پڑتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں آپؐ نے وہ نظام قائم فرما دیا جس میں اختیارِ اعلیٰ (Supreme Authority) اور حاکمیتِ مطلقہ کا مالک فقط اللہ عزوجل ہی کو تسلیم کیا گیا تھا۔

خیال رہے کہ تکبیرِ ربّ کی ذمہ داری آنحضور ﷺ کو مرتبہ رسالت پر مامور ہونے کے وقت ہی سونپ دی گئی تھی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے اور مجھے بھی اس سے اتفاق ہے کہ پہلی وحی یعنی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے آنحضور ﷺ کی نبوت کا اور دوسری وحی یعنی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات سے آنحضور ﷺ کی رسالت کا

آغاز ہوا تھا۔ واللہ اعلم!

(۲) **اقامتِ دین**: اسی ذمہ داری کے لیے دوسری اصطلاح اقامتِ دین ہے جو ایک دوسری مکی سورت سورۃ الشوریٰ میں وارد ہوئی۔ فرمایا گیا:

﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (آیت ۱۳)

''دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقے میں نہ پڑو۔''

قائم کون سی چیز کو کہتے ہیں؟ اس کو جو کھڑی ہو۔ زمین پر پڑی ہوئی چیز تو قائم نہیں کہلاتی۔ کوئی چیز گر جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو قائم کرؤ اسے کھڑا کرو۔ دین اگر پہلے سے قائم ہے تو اسے قائم رکھنا اہلِ دین کی ذمہ داری ہوگی اور اگر زمین بوس ہو تو اس کا اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا ہے کہ اسے قائم کریں اسے کھڑا کریں۔ اسی دین کے مطابق نظامِ معیشت و معاشرت استوار ہو اسی کے مطابق نظامِ حکومت و سیاست قائم ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو ''اَقِيْمُوا الدِّيْنَ'' کا تقاضا پورا ہو رہا ہے اور اگر نہیں تو جان لیجیے کہ محض تلاوت اور مدح سرائی کے لیے تو یہ دین نہیں اُتارا گیا —— دیکھئے سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (آیت ۶۸)

''(اے نبی صاف صاف) کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔''

یہاں وہی لفظ اقامت (قائم کرنا) آیا ہے۔ اب اس آیت میں بغرضِ تفہیم ''يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ'' کی جگہ ''يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ'' اور ''تورات و انجیل'' کی جگہ ''قرآن'' رکھ دیجیے تو بات یوں ہوگی: يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ کہ اے اہلِ قرآن! اے حاملانِ کتاب اللہ! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو۔ قرآن حکیم اگر واقعی ضابطۂ حیات ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے تو اس کو نافذ کیا جانا چاہیے۔ قرآن نے اگر کوئی نظام دیا ہے اور واقعی دیا ہے تو وہ نظام قائم ہونا چاہیے۔ یہ مختصر شرح ہوئی ''اقامتِ دین'' کی جو

مکی دَور کی دوسری اصطلاح ہے۔

(۳) **یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰه** : یہ تیسری اصطلاح مدنی دور کی ہے اور یہ دو سورتوں (البقرۃ اور الانفال) میں آئی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۹۳)

''اور جنگ کرو ان (مشرکین) سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے!''

سورۃ الانفال میں بات اور آگے بڑھی۔ وہاں فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹)

''اور (مسلمانو!) تم ان سے جنگ جاری رکھو جب تک فتنہ فرو نہ ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔''

یہ نہ ہو کہ دین کو اجزاء میں تقسیم کر لیا جائے—— مسجد میں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہوں، روزے بھی بڑے اہتمام سے رکھے جا رہے ہوں، چلیے زکوٰۃ بھی جیسے تیسے ادا کی جا رہی ہو، حج اور عمرے بھی ذوق وشوق سے ہو رہے ہوں—— لیکن ملک میں قائم نظامِ حکومت کے ڈھانچے میں دین کو کوئی دخل نہ ہو! مالی معاملات کو ہم شریعت کے تحت لانے کے لیے کسی طور پر تیار نہ ہوں اور اس سے گریز کے لیے عذرات کا انبار لگا دیں، حدود و تعزیراتِ اسلامی کے نفاذ کا فیصلہ اگر کر بھی لیں تو اس پر عمل درآمد کے لیے عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو۔ ستر و حجاب کے احکام کے بارے میں ہماری سوچ یہ ہو کہ یہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے، لہٰذا ان کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس معاملے میں دین کے احکام کی پوری ڈھٹائی سے خلاف ورزی میں ہمارے قدم آگے بڑھتے چلے جائیں اور مَرد وزن کی مساوات اور زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں دونوں کو شانہ بشانہ مواقع فراہم کرنا ہمارا نعرہ (slogan) بن جائے، عورت کے تقدس کو ہم برسرِ بازار نیلام کریں اور اسے اشتہار و تشہیر کی جنس بنا کر رکھ دیں۔

ہمارا حال تو اتنا پتلا ہے کہ صدر ایوب کے دَور میں جو عائلی قوانین بذریعہ آرڈی نینس جاری ہوئے تھے اور جن کی اکثر دفعات کو پاکستان میں موجود تمام فرقوں کے علماء

نے متفقہ طور پر خلافِ اسلام قرار دیا تھا، ان کو قانونی طور پر شریعت کورٹ میں زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے کہ معلوم ہے کہ شریعت کورٹ خلافِ شریعت دفعات کو گوارا نہیں کرے گی اور اس طرح مغرب زدہ اور اباحیت پسند خواتین وحضرات کے ایک چھوٹے لیکن بااثر طبقے کی ناراضگی کا اندیشہ ہے اور اس طبقے کو مطمئن رکھنا ضروری ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہمیں اس مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے کا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ ہم نے دین کے حصے بخرے کر دیے ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ''شریعت کورٹ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا لیکن طے کر دیا گیا کہ فلاں فلاں اُمور اس کورٹ کے دائرے سے باہر ہیں، حتیٰ کہ عائلی قوانین بھی اس کی حدودِ کار میں نہیں آتے۔ حالانکہ عائلی قوانین پر قرآن حکیم نے سب سے زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے، اور یہ بحث ایک دو نہیں، متعدد سورتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے یہ عائلی قوانین وہ تھے جن کو انگریز تک نے نہیں چھیڑا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انگریز نے ہمارے Personal Law کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کے بعد اسلام کے عائلی قوانین کی کتر بیونت کی گئی۔ ایک مارشل لاء آیا تو یہ مسخ شدہ غیر اسلامی قوانین نافذ ہوئے اور دوسرا مارشل لاء آیا تو اس نے ان کو تحفظ دیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو کام غیروں نے ہمارے دورِ غلامی میں نہیں کیا وہ اپنوں نے آزادی ملنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے کیا۔

تو تیسری اصطلاح ہمارے سامنے سورۃ البقرۃ اور سورۃ الانفال کی دو آیات کے حوالے سے یہ سامنے آئی کہ دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو۔ جیسا کہ میں نے عبادت کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ عبادت وہی ہوگی جو پوری زندگی پر محیط ہو، اسی طرح ''اقامتِ دین'' کے بارے میں نوٹ کر لیجیے کہ یہ اقامت پورے اور مکمل دین کی ہوگی۔ یہ نہیں کہ ایک حصہ ہمیں پسند نہیں، وہ مشکل ہے، لہٰذا وہ قائم نہ کریں، اور جو حصہ ہمیں پسند ہے اور آسان ہے وہ قائم کر دیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ ہوئی بلکہ یہ تو اپنے من کی چاہت ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہے!

(۴) **غلبۂ دین حق**: اس سلسلے کی چوتھی اور عظیم ترین اصطلاح وہ ہے جو سورۃ الصّف میں

وارد ہوئی اور جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت کا اصل موضوع ہے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (آیت ۹)

’’وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ غالب کر دے اس کو تمام جنسِ دین (یا تمام نظام ہائے اطاعت) پر۔‘‘

یہ الفاظ ایک شوشے کے فرق کے بغیر سورۃ الصّف کے علاوہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں بھی آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں آخری ٹکڑا آیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ اور سورۃ الفتح میں ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾۔ اس طرح ان تین مقامات کے حوالے سے ’’**اظهارُ دینِ الحقِّ علی الدّین كُلِّهٖ**‘‘ کی یہ اصطلاح سامنے آئی۔

آپ نے دیکھا کہ اصطلاحات ثقیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اصل باتوں کو سادہ ترین الفاظ میں آپ کے سامنے رکھا۔ ان کا پھر اعادہ کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ دین پر خود عمل پیرا اور کاربند ہو۔ دوسری یہ کہ دین کو پھیلاؤ۔ اور تیسری بات یہ کہ دین کو قائم کرو۔ یہ ہیں تین فرائض جو ہم پر دین کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کلمۂ شہادت ان کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے' اور نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ اس کے چار ستون ہیں۔ ان چار ستونوں پر یہ تین منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ اہم ترین دینی اصطلاحات کے حوالے سے ان تین منزلوں کو (۱) عبادتِ ربّ (۲) شہادت علی الناس اور (۳) اقامتِ دین کا نام دیا جائے گا۔ اگر آپ کے ذہن میں دینی فرائض کا یہ تصور موجود ہے تو بنیادی خاکہ مکمل ہو گیا' اور اگر یہ نہیں ہے اور ذہن میں صرف نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ ہی ہیں تو پھر ستون ہی ستون ہیں' چھت تو آپ کے سامنے ہے ہی نہیں۔ بغیر چھت کے جو ستون ہوتے ہیں وہ تو بطورِ یادگار کھڑے رہ جاتے ہیں' ان کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ آثارِ قدیمہ ہو سکتے ہیں' اور تو کوئی مقصد پورا نہیں کرتے۔ چنانچہ فرائض دینی کی عمارت کا خاکہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ارکانِ اسلام یعنی کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ پر اسلام' اطاعت اور عبادتِ ربّ کی پہلی منزل استوار ہوتی ہے۔ تبلیغ ودعوت' امر بالمعروف

ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس اس کی دوسری منزل ہے' جبکہ تکبیر ربّ' اقامتِ دین' کُل کا کُل دین اللہ ہی کے لیے ہو اور اظہارِ دین الحق یعنی اس دین حق کو غالب و قائم کر دیا جائے' یہ تیسری منزل ہے۔ یہ خاکہ اپنے ذہن میں رکھئے تو آپ کے سامنے صحیح تصور آئے گا کہ ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہمارے دینی فرائض کیا ہیں؟ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندۂ مؤمن سے مطالبات کیا ہیں؟

فرائضِ دینی کے تین لوازم

پہلا لازمہ ——— جہاد

اب آیئے ان تین اُمور کی طرف جن کی حیثیت ان فرائض کے لوازم یعنی لازمی تقاضوں کی ہے۔ ان میں سے پہلے لازمی تقاضے کو سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہو گا کوشش اور کشاکش۔ غور کیجیے کہ کوشش اور محنت کیے بغیر کیا یہ منزلیں سر ہو سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ محض کوشش اور محنت سے بھی کام نہیں بنتا' اس لیے کہ یہاں خلاء تو ہے نہیں۔ آپ اگر اپنے نظریات کے مطابق کوشش کر رہے ہیں تو اور لوگ بھی تو ہیں جو اپنے نظریات کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا کوشش' کوشش سے ٹکرائے گی۔ جب کوششیں باہم ٹکراتی ہیں تو اس کا نام ہوتا ہے کشاکش' جسے عام طور پر کشمکش بھی کہا جاتا ہے۔ اس کشاکش یا کشمکش کے لیے دینی اصطلاح ’’جہاد‘‘ ہے۔ یہ جہاد وہ پہلا لازمی عمل ہے کہ اگر یہ ہو گا تو دین کے وہ تین بنیادی تقاضے پورے ہوں گے جو ہمارے سامنے آئے' ورنہ نہیں۔ اب اس لفظِ جہاد کو ان تین بنیادی تقاضوں کے حوالے سے بھی سمجھ لیجیے۔

(۱) **جہاد مع النفس**: فرائضِ دینی کی پہلی سطح یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کی سطح پر جہاد کس سے ہو گا؟ اپنے نفس سے ——— اپنے نفس کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے کشاکش کرنی ہو گی' کیونکہ نفس تو کسی اور طرف زور لگاتا رہتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳)۔ وہ حرام کی طرف بڑھنا چاہتا ہے' آپ کو اسے روکنا ہو گا۔ اس کے اندر خواہشات کا سرکش گھوڑا ہے' آپ کو اسے لگام دینی ہو گی۔ صبح ہو گئی ہے' اذان سن لی

ہے' اللہ کی پکار آ گئی ہے' نفس کہتا ہے کہ سوتے رہو۔ اس سے کشمکش کریں گے اور اسے زیر کریں
گے تو نماز کے لیے کھڑے ہو سکیں گے' ورنہ نہیں۔ اگر اُس وقت ذرا سی کروٹ لی اور چادر اوپر
سرکالی کہ ابھی اٹھتے ہیں تو پھر اٹھنا محال ہے۔ یہی کشمکش و کشاکش دراصل جہاد کی پہلی اور اہم
ترین سطح ہے۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ)) (۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے
رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''اے اللہ کے رسول ﷺ!
بہترین جہاد کون سا ہے؟'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِیْ ذَاتِ
اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (۲) ''یہ کہ تو اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان سے جہاد
کرے''۔ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے روزمرہ کے معمولات کو اللہ کے احکام کے تابع رکھنے
کو ''جہادِ اکبر'' قرار دیا' اور یہ موقع سفرِ تبوک سے واپسی کا تھا جس سے زیادہ طویل اور سخت سفر
شدید گرمی کے موسم میں کوئی اور نہیں ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس سفر سے مدینہ منورہ
مراجعت ہو رہی تھی تو اس موقع پر فرمایا: ((رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ
الْاَکْبَرِ))(۱) ''ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہیں''۔ یعنی لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ
اعداء سے مقابلہ اور کشاکش ہی جہاد ہے' بلکہ یہ جو ہمارے اندر بیٹھا ہوا دشمن ''ہمارا نفس'' ہے' اہم
ترین کشاکش اس سے کرنی پڑتی ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کی پہلی سطح اور اس کا پہلا مرحلہ
''جہاد مع النفس'' ہے۔ یعنی اپنے نفس کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی!

(۲) **جہاد بالقرآن**: دینی فرائض کے دوسرے مرحلے یعنی تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف و
نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس کی سطح پر جہاد کی صورت کیا ہوگی؟ دیکھئے! آپ اگر دین کی تبلیغ
کر رہے ہیں' اس کی دعوت دے رہے ہیں تو الحاد' دہریت' مادہ پرستی' فسطائیت' اشتراکیت اور
دوسرے اَدیان و مذاہب باطلہ کے مبلغین بھی تو آپ کے اسی معاشرے میں موجود ہیں۔ آپ
اسلام کے قائل ہیں تو کفر کی طاقتیں بھی یہیں موجود ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی سطح پر ان سے کشمکش و
کشاکش ہوگی۔ البتہ یہ کشاکش نظریاتی سطح پر ہوگی' خیالات کی سطح پر' فلسفہ و فکر کی سطح پر ——

اس کشاکش میں مال اور جسم و جان کی توانائیاں کھپانی پڑیں گی۔ رسول اللہ ﷺ جب توحید کی
دعوت دے رہے تھے تو آپ ؐ کے مقابل ابوجہل اور اس کے ساتھی شرک اور بُت پرستی کے علمبردار
بن کر کھڑے تھے۔ چنانچہ باہم کشاکش ہوئی یا نہیں؟ پس تبلیغ و دعوت' امر بالمعروف و نہی عن المنکر
اور شہادت علی الناس کے فرائض کی ادائیگی کے لیے جب آپ محنت' کوشش اور جدوجہد کریں
گے تو اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی کفر اور الحاد میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے تو یہ
محض ایک مغالطہ ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آپ کو کشمکش و کشاکش سے سابقہ پیش آ کر رہے
گا۔ اب مرحلہ مشکل تر ہو گیا۔ پہلے تو اپنے باطن میں کشاکش والا معاملہ تھا' جہاد مع النفس تھا' اب
دعوت و تبلیغ کے لیے' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اور شہادت علی الناس کے لیے آپ کو
جہاد کرنا ہوگا' کشمکش کرنی پڑے گی باطل کے ساتھ' الحاد کے ساتھ' اباحیت کے ساتھ اور تمام باطل
نظریات کے ساتھ۔

اس جہاد اور کشاکش میں تلوار کون سی چلے گی؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان
میں رہنمائی فرمائی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾﴾ کہ اے نبیؐ! ان کفار سے جہاد کیجیے
اس قرآن کے ساتھ' زبردست جہاد۔ یہاں ''بِہٖ'' کی ضمیر مجرور قرآن کی طرف جا رہی ہے۔
فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہارے ہاتھ میں قرآن دیا ہے' یہ وہ تلوار ہے جو ہر باطل نظریے کو کاٹ
پھینکنے والی ہے۔ ایک تلوار لوہے کی ہوتی ہے' اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ قرآن بھی ایک تلوار
ہے۔ علامہ اقبال نے اس کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نفس اور شیطان
کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے یہی قرآن کی تلوار کام دے گی: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اَعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

''ابلیس کو ہلاک کرنا ایک مشکل کام ہے' اس لیے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں کے

اندر روپوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ تم اسے مسلمان کرلو اور (اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ) تم شمشیرِ قرآنی کے ذریعے اسے گھائل کرو!''

چنانچہ نفس امّارہ کو بھی مارو گے تو قرآن کی تلوار سے مارو گے' ویسے یہ نہیں مرے گا۔ اور شیطان سے لڑنے کے لیے بھی یہی تلوار کام آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھ میں قرآن مجید کی صورت میں دی ہے اور جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے' جسے ہم نے ''کتابِ مقدس'' بنا کر طاقوں میں رکھ چھوڑا ہے۔ تو یہ جہاد کی دوسری سطح ہوئی۔ یعنی فکری ونظریاتی سطح پر کشاکش اور تصادم۔ حق کا بول بالا کرنا' یعنی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے جان و مال سے سعی و جہد کرنا۔ اس کے لیے زبان بھی استعمال ہوگی اور قلم بھی۔ اس میں تمام ذرائع ابلاغ اور نشر واشاعت کے تمام وسائل استعمال ہوں گے اور ان سب کے ذریعے قرآن مجید کی دعوت اور اس کے پیغام کو پھیلایا جائے گا۔

(۳) **قتال فی سبیل اللہ** : تیسری سطح یعنی اللہ کے دین کو بالفعل قائم ونافذ کرنے کے مرحلے پر یہ جہاد بھی اپنی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور یہ جہاد کا تیسرا اور بلند ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں باطل کے علمبرداروں کے ساتھ کشاکش اور تصادم ہوگا۔ دعوت وتبلیغ کے مرحلے میں کشاکش اور تصادم باطل نظریات کے ساتھ تھا' لیکن جب دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آئے گا تو یہ کشاکش اور تصادم محض باطل نظریات سے نہیں بلکہ باطل کے علمبرداروں اور باطل کی قوتوں کے ساتھ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ اس راستے میں مزاحم ہوں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ ٹھیک ہے' ہم ہٹ جاتے ہیں' آپ آیئے اور اپنا دین قائم ونافذ کر دیجیے! ؏ ایں خیال است ومحال است و جنوں! ہر نظامِ باطل کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات (privileged classes) کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے طبقات کے ہاتھوں میں ملک کے معاملات کی زمامِ کار ہوتی ہے۔ تو کیا ایسے تمام طبقات کبھی یہ گوارا کریں گے کہ آپ وہ رائج نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں' ہٹا کر دین کا نظام مکمل طور پر قائم کر دیں؟ اس بات کو وہ لوگ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان کے ساتھ لازماً پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی۔ اس پنجہ آزمائی کی بھی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح صبر ومصابرت اور استقامت (Passive Resistance)

کی ہے۔ دوسری سطح اقدام (Active Resistance) کی ہے' جبکہ تیسری سطح مسلح تصادم (Armed Conflict) کی ہے۔ اہل حق اگر کمزور ہوں تو جب تک طاقت حاصل نہ ہو جائے انہیں صبر محض کی روش پر عمل کرنا ہوگا۔ وہ مار کھائیں گے لیکن ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے' کیونکہ حکمت اسی میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں اسی حکمت پر عمل ہوا۔ وہاں اہلِ ایمان کو یہی حکم تھا کہ مصائب جھیلو' ظلم و تعدی برداشت کرو لیکن ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ یہ ہے صبر و مصابرت' یعنی Passive Resistance—— لیکن جب طاقت حاصل ہو جائے تو پھر انہیں اجازت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ چنانچہ وہی مسلمان جو مکہ میں ہاتھ نہیں اُٹھا رہے تھے' مدینہ میں ان کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ انہیں اذنِ قتال دے دیا گیا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ﴿۳۹﴾﴾ (الحج)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف (کفار کی طرف سے) جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

تو جان لیجیے کہ اس کشمکش کا آخری مرحلہ مسلح تصادم (Armed Conflict) ہے' یعنی قتال فی سبیل اللہ۔ اور یہ جہاد کی چوٹی ہے۔ سورۃ الصّف میں واضح فرما دیا گیا ہے کہ یہی چوٹی محبوبیت ربّ کا مقام ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾

''بلاشبہ اللہ کو تو اپنے وہ بندے محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس طرح صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

اس موقع پر میں صحیح مسلم کی ایک حدیث شریف کا حوالہ دے رہا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِہٖ نَفْسَہٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِنَ النِّفَاقِ))[1]

''جو شخص اس حال میں مر گیا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔

میں اس کی تمنا ہی پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔"

چنانچہ دل میں یہ تمنا ضرور رکھنی چاہیے۔ اگر دل میں فی الواقع ایمان موجود ہے تو یہ آرزو ضرور رہے کہ کوئی وقت آئے کہ خالصتاً اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ہم اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹا کر سرخرو ہو جائیں۔ اگر اس تمنا سے سینہ خالی ہے تو اس سینے میں نفاق ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ہے۔

دوسرا لازمہ ——— التزامِ جماعت

فرائضِ دینی کے ضمن میں دوسرا لازمی تقاضا التزامِ جماعت ہے۔ کون ہے جو بقائمی ہوش و حواس یہ کہہ سکے کہ یہ کام انفرادی طور پر ہو سکتے ہیں؟ کوئی ایک بھی سلیم العقل شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ ان کاموں کے لیے جماعت ضروری نہیں۔ اگر یہ اُمور یعنی عبادتِ ربّ، اطاعتِ ربّ، شہادت علی الناس، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ فرائضِ دینی ہیں تو ان کے لوازم کا شمار بھی فرائض میں ہوگا، کیونکہ جو شے فرض کی ادائیگی کے لیے لازمی ہو وہ بھی فرض ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے لیے وضو شرط ہے تو وضو بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے احرام شرط ہے تو احرام بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ لہٰذا التزامِ جماعت بھی لازم و واجب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا حکم ہے، جسے حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

"(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: التزامِ جماعت کا، (امیر کا حکم) سننے اور ماننے کا، ہجرت کا، اور اللہ کے راستے میں جہاد کا!"

ہجرت کیا ہے؟ یہ کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دینا جو اللہ کو پسند نہ ہو ——— جیسے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ؟ تو آپؐ نے جواب دیا: ((اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ

(۱) مسند احمد ۴/۱۳۰۔ وسنن الترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

رَبُّکَ)) (۱) ——— یہاں تک کہ وقت آئے اور گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی انسان ہر دم آمادہ رہے۔ اور یہ ہجرت کی چوٹی ہے۔ جیسے جہاد کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے اسی طرح ہجرت کی چوٹی اللہ کے دین کے لیے ترکِ وطن ہے۔ رہا جہاد فی سبیل اللہ تو اس کا آغاز مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال ہے۔ اور سب سے پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یہ ہے التزامِ جماعت کی فرضیت!

اب یہ آپ حضرات کے سوچنے کی بات ہے کہ آپ کسی ایسی جماعت میں شامل ہیں یا نہیں جو اقامتِ دین کے لیے، دین کو قائم کرنے کے لیے، دین کو برپا کرنے کے لیے اور دین کو شہادت علی الناس کی سطح پر دنیا میں پھیلانے کے لیے قائم کی گئی ہو۔ باقی اگر آپ نے رفاہِ عامہ، خدمتِ خلق، اشاعتِ تعلیم یا اپنے پیشہ ورانہ مفادات کے تحفظات کے لیے کوئی انجمن، کوئی ادارہ یا کوئی ایسوسی ایشن بنائی ہوئی ہو تو اس پر "جماعت" کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس حدیث کی رو سے تو وہ جماعت درکار ہے جس کا مقصدِ وجود اللہ کے دین کا غلبہ ہو۔ بقول علامہ اقبال: ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

اور: ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

اور یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس جماعت کا نظام ٹھیٹھ اسلامی اصول "سمع و طاعت" پر ہونا چاہیے، جس کا حکم بھی مذکورہ بالا حدیث میں "بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ" کے الفاظ میں آیا ہے۔ اگر آپ ایسی کسی جماعت میں شامل نہیں ہیں تو دین کے یہ تقاضے گویا آپ کے سامنے ہی نہیں ہیں۔

تیسرا لازمہ ——— بیعت

دینی فرائض کے لوازم میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کا جو نظام قائم ہو وہ بیعت

(۱) سنن النسائی، کتاب البیعۃ، باب ھجرۃ البادی۔ عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما۔

پر مبنی ہو۔ یہ وہ واحد نظام ہے جو ہمیں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے سے ملتا ہے۔ کتاب و سنت میں مجھے اس کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں ملا اور نہ کوئی مجھے آج تک بتا سکا۔ اب یہ بات سمجھئے کہ یہ بیعت ہے کیا! ایک شخص سے ان فرائض کی ادائیگی کے ارادے سے شخصی تعلق قائم کرنا' اس کے ہاتھ پر ان فرائض کی انجام دہی کے لیے قول و قرار کرنا بیعت ہے۔ میں نے شروع ہی میں لفظ ''مرید'' کی وضاحت کر دی تھی کہ مرید وہ ہے جو ارادہ کرے۔ یعنی ایسا فرد جو اپنی اصلاح کے ارادے سے کسی کے ہاتھ پر قول و قرار کے لیے بیعت کر لے۔ چنانچہ شخصی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے لیے بیعت کی جاتی ہے۔ اور یہ بیعت اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کے تقاضوں اور مطالبوں پر پورا اترنے کے لیے کسی مردِ صالح کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ یہ بیعت ''بیعت توبہ'' یا ''بیعت ارشاد و تزکیہ'' کہلاتی ہے ـــــ اور جب اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت' دین کی نشر و اشاعت' شہادت علی الناس اور اقامت دین جیسے عظیم فرائض کی ادائیگی اور اس کے لیے سمع و طاعت پر مبنی جماعت کے قیام اور ہجرت و جہاد کا مرحلہ درپیش ہو تو اس کے لیے بھی ایسے شخص کے ہاتھ پر جو اِس کام کا عزم لے کر اُٹھا ہو' شخصی بیعت ہوگی اور یہ بیعت ''بیعتِ جہاد'' کہلائے گی۔

ماضی قریب میں برعظیم پاک و ہند میں برپا ہونے والی سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم تحریک ''تحریک شہیدین'' کے نام سے موسوم ہوئی' اس لیے کہ اس میں دوسری اہم شخصیت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شامل تھی۔ ورنہ نمعلوم کتنے ہزاروں مسلمان اس میں شہید ہوئے: ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس تحریک کے نتیجے میں اس برعظیم پاک و ہند میں خالصتاً اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جہاد و قتال ہوا۔ اس میں سید احمد شہید بریلویؒ نے پہلے بیعت ارشاد لی اور پھر بیعت جہاد ـــــ اور اس بیعت جہاد کی وہ آخری منزل بھی آئی کہ سیف بدست میدانِ جنگ میں قتال کیا اور سکھوں کی فوج کے ہاتھوں گردن کٹوا کر بارگاہِ ربّ العزت میں سرخرو ہو گئے۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

اس تحریک کا نظم شخصی بیعت پر قائم ہوا تھا' لیکن آج یہ لفظ گالی بن گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو لفظ مرید بھی بدنام ہو گیا' اور پھر اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو اِن شاءاللہ ترک نہیں کریں گے' بلکہ ان میں اصل روح پھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔

اب ذرا مزید توجہ کیجیے۔ ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں دینی حلقوں میں یہ تصور عام رہا ہے اور آج بھی ہے کہ اگر کسی کی بیعت کا حلقہ تمہاری گردن میں نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ دین کا صحیح تقاضا پورا نہیں ہو رہا۔ میں کہتا ہوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ:

''اگر بیعت جہاد کے لیے آپ کسی کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں' تو دین کے وہ تقاضے اور فرائض' جو میں نے قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں' وہ پورے نہیں ہو سکتے۔''

البتہ یہ ضرور ہے کہ اب چونکہ کوئی نبی نہیں' کوئی معصوم نہیں' لہٰذا آپ کو خود تلاش کرنا پڑے گا کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو ''مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ؟'' کی صدا لگا رہا ہو اور ان فرائض کی انجام دہی کے لیے کوشاں ہو اور آگے بڑھ رہا ہو! اور اگر آپ کا دل اس پر مطمئن ہو جائے' اس کے فہم اور اس کے خلوص و اخلاص پر آپ کو اعتماد پیدا ہو تو اس کے ساتھ وابستہ اور منسلک ہو جایئے!...... میں کہا کرتا ہوں کہ اس طرح اگر ہزار قافلے بھی بن جائیں تو کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ منزل ایک ہو۔ اگر دینی فرائض کا تصور صحیح ہو' اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بیک وقت کئی قافلے اس تصور کو لے کر رواں دواں ہو جائیں۔ منزل تو سب کی ایک ہی ہوگی۔ میرے نزدیک سب کا ایک ہونا اب لازم نہیں ہے۔ سب کا ایک ہونا صرف رسول

کے ساتھ ہونا لازم ہوتا ہے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ ایامِ حج میں جب منیٰ سے وقوفِ عرفات کے لیے سفر ہوتا ہے تو بیک وقت ہزاروں قافلے چلتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا جھنڈا الگ ہوتا ہے۔ لیکن سب کا رُخ کس طرف ہے؟ عرفات کی طرف! منزل تو سب کی ایک ہی ہے۔ چنانچہ اگر ہزاروں قافلے بھی ہو گئے تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر کوئی شریکِ سفر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قافلے والوں میں فرائض دینی کا صحیح اور مکمل تصور ہی مفقود ہے، یا یہ کہ جو راستہ اختیار کیا جا رہا ہے اس کا رُخ منزل کی طرف صحیح طور پر نہیں ہے، بلکہ شاہراہ کو چھوڑ کر کوئی شارٹ کٹ اختیار کر لیا گیا ہے، جس کی بدولت منزلِ مقصود تک جلد پہنچنے کی بجائے یہ قافلہ اس شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ میں ایسا اُلجھ کر رہ گیا ہے کہ منزل کو جانے والی اصل شاہراہ سے تعلق ہی منقطع ہو گیا ہے، یا کسی قائد پر دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ صحیح شخص نہیں ہے، یا مخلص نہیں ہے، محض دکاندار ہے تو ایسی صورت میں وہ کسی اور کو تلاش کرے، یا پھر خود کھڑے ہو کر پکارے کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ خود قافلہ بنانے کی سعی کرے ——— یہاں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، تمام حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا قافلہ نہیں بنا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر نیت صاف ہو، دل میں خلوص ہو، دوسروں سے الجھنے سے اجتناب ہو، سامنے منزل اقامتِ دین کی ہو تو خواہ سینکڑوں قافلے ہوں یا ہزاروں، کوئی مضائقہ نہیں۔ خلوص و اخلاص ہوگا تو وقت آنے پر وہ باہم جڑتے چلے جائیں گے۔ اور اگر چلنا ہی نہیں ہے تو تم بھی کھڑے ہو، ہم بھی کھڑے ہیں ع زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد ——— یہ ہے طرزِ عمل جو ہمارا آج ہے۔ اور بعض لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ نہ چلیں گے نہ چلنے دیں گے، نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے۔ تو ہر طرزِ عمل آپ کو مل جائے گا۔ لیکن جسے بھی چلنا ہے اور اس کی چلنے کی نیت ہے تو وہ کوئی قافلہ تلاش کرے اور جس پر بھی دل مطمئن ہو جائے اس میں شامل ہو جائے۔ اس کے بعد آنکھیں کھلی رکھے، کان کھلے رکھے، دائیں بائیں دیکھتا رہے، اس سے بہتر قافلہ ملے تو اس کی طرف لبیک کہے۔ آخر دُنیوی معاملات میں بھی ہمارا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے نا کہ ع "ہے جستجو کہ

خوب سے ہے خوب تر کہاں!" ——— یہ تو نہیں ہوتا کہ آپ کہیں کہ اب میں ایک کاروبار شروع کر چکا ہوں، کیا کروں؟ اس میں تو منافع نہیں ہے، ہے تو بہت قلیل، اصل میں مجھے فلاں کاروبار کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ آپ اپنے کاروبار کی بساط لپیٹیں گے اور کوئی دوسرا کام شروع کر دیں گے۔

حرفِ آخر

حضرات! یہ چھ باتیں میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ ان سے ہمارے سامنے اپنے دینی فرائض کا ایک صحیح اور جامع خاکہ آ گیا ہے، اس کے علاوہ باقی تو ساری تفاصیل ہیں۔ اگر خاکہ نامکمل رہے گا تو آپ کا فرائضِ دینی کا تصور نامکمل رہے گا، لہٰذا ایک مکمل اور جامع خاکہ سامنے ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل ضرورت قدم بڑھانے کی ہے۔ اگر آپ نے منزلِ مقصود کے تعین کے ساتھ سفر کا آغاز کر دیا تو اگر منزل تک نہ بھی پہنچ سکے تب بھی آپ کامیاب ہیں۔ ہمارے دین کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوگا۔ جو شخص گھر سے ہجرت کی نیت سے مدینہ کے لیے نکلا تو خواہ وہ مدینہ پہنچ سکا یا نہیں پہنچ سکا، وہ مہاجر ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ہجرت کی نیت سے گھر سے نکل آیا اور راستہ ہی میں اسے موت آ گئی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا:

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۰۰)

لہٰذا جو آغاز کر دے اس کا اجر محفوظ ہے۔ رہا یہ سوال کہ کہاں تک پہنچ پائیں گے، اس کا کوئی پتا نہیں۔ شہیدینؒ کی تحریک اگرچہ دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئی اور وہ خاک و خون میں لوٹ گئے، لیکن وہ اللہ کے ہاں فلاح پائیں گے۔ اگر دُنیوی لحاظ سے بھی یہ تحریک کامیاب ہو گئی ہوتی تو پورا برعظیم پاک و ہند دارالاسلام بن سکتا تھا۔ ورنہ یہ علاقہ جو پاکستان کہلاتا ہے، ضرور دارالاسلام بن جاتا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ اس تحریک کی ناکامی میں اصل ہاتھ کن لوگوں کا تھا! سکھوں کی تلواریں اسے ختم نہیں کر سکتی تھیں، خود اپنوں کی غداری نے اسے ختم کیا تھا۔

ایک بندۂ مؤمن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبۂ اُخروی میں کامیابی

ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے قرآن حکیم اور سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہمیں ہمارے دینی فرائض کا ایک مکمل خاکہ ملتا ہے' جو تین جامع ترین اصطلاحات عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے حوالے سے ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اس کے لوازم بھی کسی قدر تفصیل سے بیان ہوگئے ہیں جن میں اہم ترین لوازم جہاد فی سبیل اللہ' التزامِ جماعت اور بیعت سمع و طاعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ان دینی فرائض کی بجا آوری کا مصمم ارادہ دلوں میں پیدا کریں اور پھر اس ارادے کی تکمیل کے لیے پیش قدمی کریں۔

وَمَا تَوفیقی اِلاَّ باللّٰہ العلیِّ العظیم

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَOO